تحصیل: ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی ۔ شمارہ:۶ ۔ جنوری۔جون ۲۰۲۰

کردار ساز اساتذہ اور ان کے چند واقعات

محمد راشد شیخ*

اسلام میں تعلیم و تعلم ہمیشہ ایک مقدس عمل رہا ہے۔ اگر ہم گزشتہ ڈیڑھ ہزار سالہ تعلیمی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ماضی قریب تک ہمیں ایسے بلند کردار اور اعلیٰ صفات کے حامل اساتذہ نظر آئیں گے جنھوں نے ساری زندگی ایثار اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا، قلیل مشاہرے پر قناعت کی اور کئی نسلوں کو نہ صرف زیورِ علمی سے آراستہ کیا بلکہ ان کی اخلاقی تربیت بھی کی۔ افسوس ہے کہ آج دولت پرستی کے سیلاب میں جہاں بہت سی اسلامی و اخلاقی اقدار خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں اور بقیہ بہتی جارہی ہیں انھی میں استاد شاگرد کے عظیم رشتے سے محرومی بھی شامل ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہم باکردار اساتذہ سے کافی حد تک محروم ہو چکے ہیں اور صورت حال بہ قول علامہ اقبال، یہ ہو چکی ہے کہ:

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجیے"

کسی قوم کے لیے ان صفات کے حامل اساتذہ ان چراغوں کی مانند ہوتے ہیں جن کی روشنی میں قوم کے افراد صالح زندگی اور صالح معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اگر یہ چراغ بجھ جائیں تو ایسی قوم کا مقدر اندھیروں میں بھٹکنا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی اخلاقی اور مادی تعمیر میں ایک باکردار اور شفیق معلّم کے خاموش اور بے غرض کام کی اہمیت اربابِ سیاست کی تگ و دو اور شور و شغل سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ جس طرح والدین کے احسانات کا بدلہ نہیں چکایا جاسکتا اسی طرح عظیم اور کردار ساز استاد کے احسانات کا بدلہ چکانا بھی ممکن نہیں۔ زندگی میں عموماً دنیاوی کامیابی اور عیش و آرام عموماً سیاست دانوں کے حصے میں آتے ہیں لیکن حقیقی نیک نامی اور خدمت کی

* سول انجینئر، مصنف، محقق، مقیم کراچی

سعادت عظیم اساتذہ کا مقدر بنتی ہے۔ ایک عظیم استاد قوم کی خاطر تکلیف کو راحت پر، خدمت کو حکومت پر اور ایثار کو دولت پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ معاشی طور پر مشکلات کا شکار رہتے ہوئے بھی قوم کی تعمیر کی خاطر ایثار کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کئی نسلوں کی علمی اور اخلاقی تربیت کرتے ہیں۔ ایسے استاد کی نظر میں غیر اہم، نقلی اور جھوٹی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے خیالات اور عمل سے وہ کردار پیش کرتے ہیں کہ اس کے شاگرد خود بہ خود زندگی کی اعلیٰ اقدار کو اپنا مطمح نظر بناتے اور ان اقدار کی پاس داری اور فروغ ان کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ ایسے ہی عظیم ایثار پیشہ اساتذہ قومی سیرت کی تعمیر کرتے ہیں۔ جو قوم ان اساتذہ کی قدر نہیں کرتی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی فکر نہیں کرتی اس میں بالآخر ایسے ایثار پیشہ اساتذہ پیدا ہونا بند ہو جاتے ہیں اور اس کی زندگی محض کاروبار، دولت آفرینی اور باہمی جنگ و جدل کا مرقع بن جاتی ہے۔

ایسے ہی عظیم اساتذہ اور ان کے چند واقعات پر راقم الحروف اپنے ذاتی مشاہدات اور مطالعے کا نچوڑ پیش نظر مضمون میں پیش کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے وطن عزیز کو اللہ تعالیٰ نے ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے، یہاں نہ کھانے کی کمی ہے نہ پینے کی، نہ اجناس کی نہ معدنیات، نہ افرادی قوت کی، نہ دریاؤں اور زرخیز زمینوں کی نہ سمندر کی۔ اگر کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے تو وہ کردار کی اور کردار سازی میں سب سے پہلے انسان کا اپنا گھر اور اس کے بعد اس کے اساتذہ کا نمبر آتا ہے۔ کیا عجب کہ ان بلند کردار اساتذہ کی روشن زندگیوں سے ہم آج کے ماحول میں روشنی حاصل کر سکیں اور ان کی پاکیزہ زندگیوں سے اپنے معاشرے میں بھی بہتری لا سکیں۔ پیش نظر مضمون میں نہایت اختصار سے ایسے چند باکردار بلکہ کردار ساز اساتذہ کے واقعات پیش کیے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس موضوع پر سنجیدگی سے تحقیق کی جائے تو کئی جلدوں پر مشتمل کتاب تالیف کی جا سکتی ہے۔

ا۔ مولانا محمد اسحاق رامپوری:

ماضی قریب کے ان اساتذہ میں جنھوں نے تمام عمر نہایت سادگی، بے غرضی اور قناعت سے زندگی گزاری مولوی محمد اسحاق رامپوری کا نام بھی شامل ہے۔ وہ رہنے والے تو رام پور کے تھے لیکن دہلی کا بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کے مزاج سے متعلق ان کے نام ور شاگرد ضیاء الدین احمد برنی اپنی معروف کتاب عظمتِ رفتہ میں لکھتے ہیں:

> مولوی صاحب بے حد سادگی پسند تھے۔ قناعت ان کے مزاج میں اس درجہ بسی ہوئی تھی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے شاگردوں سے کبھی کوئی فیس نہیں لی اور نہ کسی

صورت میں کوئی ہدیہ یا نذرانہ ہی قبول کیا۔ ان کی ضروریات زندگی نہایت مختصر تھیں اور میں نے کبھی انہیں اس بنا پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا[1]۔

مولوی محمد اسحاق رامپوری کا انتقال ۱۹۳۰ء کے اوائل میں دہلی میں ہوا۔

۲۔ شمس العلماء مولوی سیّد میر حسن

مولوی سیّد میر حسن کا نام نامی ماضی کے عظیم، باکردار، متقی اور صالح اساتذہ کی صف میں ایک نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی وجہِ شہرت علامہ اقبال کے استاد محترم کی حیثیت سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ایک طویل عرصے تک سیالکوٹ شہر میں کئی نسلوں کو زیورِ علمی کے ساتھ ساتھ کردار کی صفات سے بھی متصف کیا۔ ان کی زندگی نیکی، ہمدردی، پرہیز گاری اور دوسروں کی غم خواری سے عبارت تھی۔ علامہ اقبال جب کم سن تھے تو ان کے والد محترم شیخ نور محمد نے انھیں مولانا غلام حسن کے درس میں بہ غرض حصول علم بٹھایا تھا۔ مولوی سید میر حسن صاحب کی مولانا غلام حسن سے دوستی تھی اور وہ اکثر ان سے ملنے جاتے تھے۔ ایک دن ان کی نظر ننھے اقبال پر پڑی تو انھوں نے مولانا غلام حسن سے دریافت کیا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ مولانا غلام حسن نے جواب دیا کہ یہ شیخ نور محمد کا صاحب زادہ ہے۔ چند روز بعد مولوی سید میر حسن صاحب کی ملاقات شیخ نور محمد سے ہوئی تو انھوں نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اپنے بچے کو میرے پاس لے آیئے، اسے میں پڑھاؤں گا۔ شیخ نور محمد مولوی صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے چناں چہ انھوں نے ننھے اقبال کو مولوی سید میر حسن کے درس میں بھیج دیا۔ اس کے بعد مولوی صاحب کے فیضِ تربیت سے اقبال، علامہ اقبال بنے اور اپنے کلام سے تمام عالم میں شہرت حاصل کی۔ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولوی سید میر حسن کی جوہر شناس نظروں نے پہلی نظر ہی میں اقبال کے جوہر کو پہچان لیا تھا اور اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر اس بچے کی تعلیم و تربیت درست خطوط پر ہو جائے تو یہ آگے چل کر مسلمانانِ عالم کے لیے ایک روشن مثال بنے گا۔ خود علامہ اقبال تمام عمر اپنے عظیم استاد کی تعریف میں رطب اللسان رہے اور جب ان کے استاد کا ذکر ان کے آگے کیا جاتا تو فرطِ عقیدت سے ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ علامہ نے اپنے کلام میں بھی متعدد مقامات پر اپنے استاد سے فیض حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے، مثلاً علامہ کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

☆

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شاد ماں مجھ کو

علامہ اقبال اپنے عظیم استاد کا کس قدر احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب گورنر پنجاب نے علامہ کو "سر" کا خطاب دینے کا عندیہ دیا تو انھوں نے فرمایا کہ پہلے میرے استاد مولوی سید میر حسن کو 'شمس العلماء' کا خطاب دیا جائے۔ جب گورنر نے علامہ سے پوچھا کہ کیا انھوں نے کوئی تصنیف بھی کی ہے تو علامہ نے جواب دیا کہ میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں۔ چناں چہ پہلے مولوی صاحب کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

مولوی سید میر حسن نہایت سادگی پسند اور شریف النفس بزرگ تھے۔ وہ اعلیٰ اسلامی اور اخلاقی اقدار پر عمل کرتے ہوئے خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم سب سے نیکی اور ہمدردی کا سلوک کرتے تھے۔ علامہ اقبال کے علاوہ مولوی صاحب کے معروف تلامذہ میں مولانا ابراہیم سیالکوٹی، منشی غلام قادر فصیح، مولوی ظفر اقبال، مولوی احمد دین، امین حزیں، پروفیسر فضل الدین قریشی، سردار کھڑک سنگھ، پنڈت بیلی رام اور لالہ نرنجن داس شامل تھے۔ مولوی سید میر حسن کا انتقال مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو سیالکوٹ میں ہوا۔ ان کی تجہیز تکفین میں مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں ہندو، سکھ اور عیسائیوں نے بھی شرکت کی تھی اور شہر میں ان کے احترام کی وجہ سے ان کے غم میں تمام شہر پر ایک سوگواری کی کیفیت طاری ہو گئی تھی[۲]۔

۳۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

ماضی قریب کے ان نام ور اساتذہ میں جن کی شخصیت اپنے تلامذہ لیے گھنی چھاؤں کی سی حیثیت رکھتی تھی، ان میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اپنے اوصاف کی بنا پر نمایاں اہمیت کے حامل تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک عظیم استاد ہونے کے باوصف سلسلۂ نقشبندیہ کے بلند پایہ شیخِ طریقت بھی تھے۔ آپ نے طویل عرصے تک شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی میں بہ حیثیت صدر شعبہ خدمات انجام دیں اور اپنے اعلیٰ کردار، تقویٰ، للّٰہیت، طلبہ سے شفقت اور ان کی

دینی اور دنیاوی ترقی کے جذبے کے تحت وہ خدمات انجام دیں کہ آج بھی جب آپ کا نام آتا ہے تو لوگ آپ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ان کا دل احترام آمیز جذبات سے لب ریز ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر غلام مصطفی خان ان خاصانِ الٰہی میں شامل تھے جن کا وجود اس سرزمین کے لیے باعثِ برکت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مورخہ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء کو آپ کا حیدر آباد میں انتقال ہوا تو تمام شعبہ ہائے زندگی اور ہر زبان بولنے والے نے اس کا افسوس کیا اور آپ کا جنازہ حیدر آباد کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ تھا۔

ڈاکٹر غلام مصطفی خاں کے شاگرد آج بھی آپ کی سادگی، خلوص، طلبہ پر شفقت کے بے شمار واقعات بیان کرتے ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے دو واقعات تحریر کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے شاگرد پروفیسر انوار احمد زئی ان کے عفو و درگزر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> عفو و درگزر ڈاکٹر صاحب کے مزاج کا حوالہ ہے۔ کچھ شاگرد، بہت سے ساتھی اور بے شمار تنگ نظر اور کوتاہ بین افراد نے ان کے ساتھ اپنے اپنے انداز میں زیادتیوں کا ارتکاب کیا مگر ڈاکٹر صاحب کے صبر اور ضبط نے ایسے لوگوں کو بار بار لہولہان کیا۔ یہ لوگ پھر سے مسلح ہو کر حملہ آور ہوئے پھر ڈاکٹر صاحب کے عفو و درگزر نے انھیں ہلکان کیا۔ یہاں تک کہ وہ نادم ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کی وضع داری پتھر کی لکیر ٹھہری [۳]۔

یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں میں سے ایک معروف شاگرد نے ایثار، بے غرضی اور طلبہ پر شفقت کا یہ عجیب واقعہ تحریر فرماتے ہیں:

> جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب صدر شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ ایک مرتبہ یہی شاگرد ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں پہنچے اور ان سے کہا کہ میرے پاس فیس کے لیے رقم نہیں ہے۔ اگر کچھ انتظام نہ ہوا تو میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کو اسی روز تنخواہ ملی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پوری تنخواہ شاگرد کے آگے رکھ دی اور فرمایا جتنی رقم درکار ہو لے لیجیے۔ شاگرد نے صرف فیس کی رقم لی اور بقیہ واپس کر دی۔ ڈاکٹر غلام مصطفی خان مرحوم کا یہ رویہ تمام شاگردوں کے ساتھ تھا۔ [۴]

۴۔ علامہ عبدالعزیز میمن

علامہ عبدالعزیز میمن عربی زبان و ادب کے نام ور محقق اور عالم ہونے کے باوصف ایک عظیم استاد بھی تھے۔ آپ برصغیر پاک و ہند کی تین معروف جامعات یعنی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، پنجاب یونی ورسٹی اور کراچی یونی ورسٹی میں صدر شعبۂ عربی رہے۔ علامہ میمن خود تو نام ور استاد تھے ہی ان کے شاگرد بھی نام ور ہوئے۔ علامہ کے ایک نام ور شاگرد ڈاکٹر نبی بخش بلوچ قیام علی گڑھ کے دوران علامہ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بہ عنوان السند تحت سیطرۃ العرب لکھ رہے تھے۔ وہ علامہ کی شفقت اور شاگردوں سے محبت کے حوالے سے اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

> استاد صاحب طالب علم کی اتنی دل کھول کر امداد کرتے ہیں کہ کئی مشکلات آسان ہو جاتی ہیں اور ہمت و حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ آج خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ رامپور کتب خانہ سے استفادہ کرنے کا ارادہ ہے۔ استاد صاحب نے فوراً تائید کی اور ساتھ لے چلے اور اپنی کوٹھی پر دو خط لکھے۔ ایک بہ نام سید بشیر حسین زیدی مدار المہام ریاست رامپور اور دوسرے جناب امتیاز علی خان عرشی مہتمم کتب خانہ کو۔[۵]

علامہ عبدالعزیز میمن نے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۵ء اورینٹل کالج لاہور میں بہ حیثیت استاد عربی خدمات انجام دیں۔ یہاں جن طلبہ نے ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ سابق پرنسپل اورینٹل کالج و صدر شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی آپ بیتی میں علامہ میمن کا طلبہ سے تعلق اور شفقت کا درج ذیل واقعہ لکھا۔ یہ واقعہ ۱۹۲۲ء کے زمانے کا ہے:

> اتفاقاً سب سے پہلے مولانا عبدالعزیز میمن ہی سے ملاقات ہو گئی۔ حالات پوچھے، بتائے۔ فرمایا: اچھا ہوا تعلیم میں واپس آ گئے ہو مگر منشی عالم کا امتحان بے کار ہے، تم منشی فاضل کا امتحان دو۔ میں نے کہا: فارم داخلہ اب کیسے تبدیل ہو گا؟ فرمایا: میں کرا دوں گا۔ چناں چہ اپنے رسوخ سے کرا دیا اور زائد فیس اپنے پاس سے دی۔[۶]

علامہ عبدالعزیز میمن کے ایک اور نام ور شاگرد ڈاکٹر مختار الدین احمد (سابق صدر شعبۂ عربی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) تھے۔ وہ اپنے مضمون بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے میں لکھتے ہیں کہ:

> انھوں نے ۱۹۴۷ء میں بی اے کیا۔ اس وقت علامہ میمن مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں بہ حیثیت صدر شعبۂ عربی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ڈاکٹر مختار الدین بی اے کے بعد ایم اے میں داخلہ لینا چاہتے تھے اور آپ کو اردو اور عربی دونوں مضامین سے دل چسپی تھی لیکن

فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کس مضمون میں ایم اے کریں۔ اسی کیفیت میں آپ علامہ میمن کے پاس بہ غرضِ مشورہ پہنچے اور ان کے طلب کرنے پر دونوں مضامین کے داخلہ فارم پیش کیے۔ علامہ نے فوراً اردو کا فارم چاک کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور عربی کے فارم پر دستخط کر کے ان کے حوالے کیا اور فرمایا: لیجیے فیصلہ ہو گیا۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ایم اے عربی کے امتحان میں ۱۹۴۹ء میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور ۱۹۵۲ء میں علامہ میمن کی نگرانی میں یہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔[۷]

۵۔ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ماضی قریب کے نام ور اور صاحب عزیمت اساتذہ میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا بھی ہے۔ آپ طویل عرصے تک پیرس میں رہے اور مورخہ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ء میں امریکا میں وفات پائی۔ ۱۹۴۸ء تک آپ بہ حیثیت استاد جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں خدمات انجام دیں۔ آپ کے اس دور کے شاگردوں میں جناب اسرائیل احمد مینائی (نبیرۂ امیر مینائی) بھی شامل ہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی طلبہ سے شفقت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

میرا معمول تھا کہ اپنی رہائش گاہ واقع کوچہ فتح سلطان سے جامعہ عثمانیہ تک روزانہ بس میں سفر کرتا۔ اسی بس سے ڈاکٹر صاحب بھی جامعہ جاتے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش کٹل منڈی میں تھی۔ یہ جگہ راقم کی رہائش کے قریب ہی واقع تھی۔ میں روزانہ صبح ساڑھے سات بجے بس میں سوار ہوتا۔ جامعہ تک سفر تقریباً نصف گھنٹے میں طے ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کا روزانہ کا معمول تھا کہ بس میں سوار ہوتے ہی ہم طالب علموں کی گنتی کرتے اور اپنا اور تمام طالب علموں کا کرایہ اپنے بٹوے سے نکال کر کنڈکٹر کو ادا کرتے۔[۸]

۶۔ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

ماضی قریب کے نام ور اساتذہ میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کا بھی ہے جنھوں نے نہ صرف زندگی بھر ایک مثالی استاد کی حیثیت سے درس و تدریس سے تعلق رکھا بلکہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء تک مسلسل دس برس تک کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اسے ایک مثالی یونی ورسٹی بنانے میں شب و روز کوشاں رہے۔ ان کے اسی دور کے حوالے سے ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنے زیادہ شان دار علمی اور تعلیمی پس منظر کے ساتھ طویل عرصے تک اپنی لیاقت اور دانش سے اور اپنی عمدہ نظامت سے جو فیض ملک اور قوم اور خاص

طور پر جامعہ کراچی کو پہنچایا ہے، وہ بھی ایک منفرد مثال ہے۔ تعلیمات سے ان کی تدریسی و انتظامی وابستگی قریب قریب نصف صدی پر محیط رہی جب کہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء تک کا عرصہ انھوں نے جامعہ کراچی کے شیخ الجامعہ کے طور پر گزارا اور اس ادارے کو ایک عام یونی ورسٹی کی سطح سے اٹھا کر واقعتاً پاکستان کی کیمبرج یونی ورسٹی کے مقام تک پہنچانے میں مثالی کامیابی حاصل کی۔[۹]

اسی مضمون میں ڈاکٹر عقیل صاحب نے جامعہ کراچی کے، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے دور اور موجودہ دورِ انحطاط کا موازنہ کچھ ان الفاظ میں کیا:

ہم نے ڈاکٹر قریشی کو جامعہ کے مختلف شعبوں اور وہاں کے انتظامات اور وہاں کی صورتِ حال کا معائنہ کرنے کے لیے دورے کرتے بھی دیکھا۔ ان کے دور میں دیواریں شفاف اور فرش صاف ستھرے ہوتے تھے لیکن اب یہ حال ہے کہ پوری جامعہ میں کوئی عمارت اور کوئی کمرہ ایسا نہیں جس میں مرمت کا ڈھیر سارا کام موجود نہ ہو۔ تقریبات کا نظم و ضبط بھی دیدنی ہوتا تھا خاص طور پر جلسۂ تقسیم اسناد ایک مثالی نظم و ترتیب اور شائستگی کی تمام تر صفات کے ساتھ اب تک ہمارے ذہنوں میں بہترین تاثرات کے ساتھ محفوظ ہے۔ ان میں ڈاکٹر قریشی کے خطبات اپنی فکری معنویت اور بلند خیالی کا ایک مرقع ہوتے تھے جن کا اسلوب اور پیرایۂ بیان بھی اپنی علمیت اور عالمانہ شائستگی کی ایک مثال ہوتا تھا۔[۱۰]

اسی مضمون میں ڈاکٹر عقیل صاحب اس افسوس ناک واقعے سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی دس سالہ مسلسل محنت اور خلوص و ایثار کا صلہ یہ دیا گیا کہ انھیں ماضی کے ایک معروف سیاست دان نے "آمر" کا خطاب دیا جس کی وجہ سے ڈاکٹر قریشی کا دل ٹوٹ گیا اور وہ کسی ادارے سے منسلک ہونے سے گریزاں رہے۔

۷۔ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ

ڈاکٹر سید عبد اللہ علامہ میمن کے نام ور شاگرد، سابق صدر شعبہ اردو، عربی، فارسی، پنجاب یونی ورسٹی، سابق پرنسپل یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور اور سابق ڈائریکٹر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور تھے۔ وہ ان عظیم اساتذہ میں شامل تھے جو اپنے مقصد اور نصب العین کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ انھوں نے زندگی بھر ذاتی منفعت، خود غرضی اور نام و نمود سے دور رہ کر کئی نسلوں کو نہ صرف زیورِ علم سے

آراستہ کیا بلکہ اعلیٰ کردار سے بھی۔ ڈاکٹر صاحب کی فرض شناسی کا ایک واقعہ ان کے شاگرد ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ان الفاظ میں بیان کیا:

> چند برس ہوئے گنگارام ہسپتال میں ڈاکٹر صاحب کا ہرنیا کا آپریشن ہوا۔ جس روز صحت یاب ہو کر ہسپتال سے نکلے موٹر پر سوار ہوئے، بیگم صاحبہ ساتھ تھیں۔ موٹر گھر کی سمت روانہ ہوئی۔ اچانک راستے میں ڈاکٹر صاحب نے موٹر رکوائی اور ڈرائیور سے کہا: موٹر کالج کی طرف لے جاؤ۔ سب حیران، کالج میں جا کر ابھی کیا کرنا ہے۔ خیر کالج پہنچے۔ فرمایا: "میں طلبہ کو درس دے کر گھر جاؤں گا، کئی روز سے یہ محرومی رہی۔" یہ تو ایک واقعہ ہے۔ کئی بار ایسا ہوا طویل سفر سے واپسی ہوئی، سیدھے کالج پہنچے، درس دیا، صحنِ کالج میں بیٹھ کر اساتذہ سے ملے، طلبہ سے باتیں ہوئیں اور پھر گھر روانہ ہوئے۔[11]

۸۔ ڈاکٹر سیّد معین الحق

ڈاکٹر سید معین الحق پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے بانی صدر اور نام ور مورخ تھے۔ وہ اپنی خود نوشت معین بیتی (مطبوعہ ۱۹۹۳ء کراچی) میں ماضی کے اساتذہ کا موجودہ عہد کے اساتذہ سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس دور میں ذمہ داریوں کا احساس کم و بیش ہر شخص کو تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اسکول میں کوئی استاد بھی کلاس میں دیر سے آنے کا عادی تھا، ادھر گھنٹہ بجا اور ادھر استاد اپنا رجسٹر لیے ہوئے کلاس میں داخل ہو گیا، اسی طرح بغیر وقت ضائع کیے وہ برابر پڑھاتا تھا۔ اساتذہ کی پابندیِ وقت اور سنجیدگی سے کام کرنے کا طلبہ پر یہ اثر ہوتا تھا کہ وہ بھی پابندی کے ساتھ وقت پر اسکول پہنچتے اور کلاسوں میں داخل ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ڈرل یعنی جسمانی ورزش اور ریسس (Recess) کے علاوہ اسکولوں کے احاطے میں یا کالجوں سے باہر طلبہ نظر نہیں آتے تھے۔ آج آزادی اور مساوات کا تصور اس قدر مسخ ہو گیا ہے کہ اس میں اور بے ادبی و بد تہذیبی میں بہت کم امتیاز باقی رہ گیا ہے۔ انتہائی تنگ دست اور محدود تعلیم حاصل کیے ہوئے اساتذہ کا بھی معاشرے میں احترام کیا جاتا تھا، شروع ہی سے طالب علم کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا تھا کہ استاد کا احترام لازمی اور ضروری ہے۔[12]

۹۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے نام ور طالب علم، استاد، سابق صدر شعبہ ءاردوو پروفیسر ایمریطس کراچی یونی ورسٹی تھے۔ ان کا انتقال مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء کو کراچی میں ہوا۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی رفت و بود میں ہمارے تعلیمی انحطاط کی وجوہات اور تدارک پر بھی متعدد مقامات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں وہ اپنے بچپن کے اساتذہ خصوصاً محلے کے مکتب کے استاد مولوی سلامت اللہ اور موجودہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے تعلیمی ماحول کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مجھے یاد نہیں کہ مولوی سلامت اللہ مرحوم سے میں نے کبھی مار کھائی ہو۔ ویسے طالب علم ان سے ڈرتے بہت تھے، شاید ان کی بھاری بھر کم شخصیت کا اثر تھا۔۔۔ اب جو حشرات الارض کی طرح قدم قدم پر بچوں کے چلڈرن پیراڈائز یعنی بچوں کی جنت اور بچوں کی نفسیاتی تربیت گاہیں، انگریزی میڈیم اسکولوں کے نام سے بکثرت ادارے محض تجارت کے لیے قائم ہیں، ان کے استادوں بالخصوص استانیوں کو دیکھیے، الّا ماشاءاللہ ان کو تعلیم، تدریس اور تربیت سے شاید ہی کوئی واسطہ یا علاقہ ہو۔ اسکول کے مالک یا مالکہ کے یہ تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں۔ ان کی صورت دیکھیے تو کسی اشتہار کی ماڈل معلوم ہوتی ہیں اور زیادہ وقت بچوں کی بجائے اپنی دیکھ بھال پر صرف کرتی ہیں۔[۱۳]

اسی کتاب میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ہمارے تعلیمی زوال کی وجوہات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> طالب علموں اور استادوں کے رشتے میں جو تقدس کا تصور تھا وہ آج داستانِ ماضی ہو چکا ہے۔ شاید ہمارے تعلیمی اور اخلاقی معیار کی پستی کا ایک سبب یہ بھی ہے۔[۱۴]
>
> ہمارے علم کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یونی ورسٹیوں میں ترقی کا دار و مدار محض علمی لیاقت، شہرت، تحقیق اور بین الاقوامی حیثیت نہیں بلکہ اس کا معیار کچھ اور ہی ہے۔[۱۵]

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے جب مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں بطور لکچرر ملازمت کا آغاز کیا، اس زمانے میں یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سر شاہ محمد سلیمان (وفات: ۱۳ مارچ ۱۹۴۱ء) تھے۔ وہ وقت کی کس قدر پابندی کرتے اور اساتذہ سے کراتے تھے، اس کا اندازہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے بیان کردہ اس واقعے سے ہوتا ہے:

> وہ وقت کے بہت پابند تھے اور چاہتے تھے کہ اساتذہ بھی پابند ہوں اور اس میں وہ ایک لمحے کی بھی ڈھیل گوارا نہیں کرتے۔ جب وہ علی گڑھ میں ہوتے تو یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں کا ٹائم ٹیبل ان کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ کبھی ایک شعبے اور کبھی دوسرے شعبے کا اچانک دورہ

کرتے کہ استاد وقت کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں۔ ایک مرتبہ میں بابِ اسحاق سے شعبے کی طرف آرہا تھا، راستے میں مڈ بھیڑ ہو گئی، گھڑی دیکھی، فرمانے لگے: آپ دو منٹ تاخیر سے آئے ہیں۔ میں نے اپنی گھڑی دیکھی، وہ دو منٹ پیچھے تھی۔ میں نے کہا: میری گھڑی میں ابھی دو منٹ باقی ہیں۔ فرمانے لگے: گھڑی وہ معیاری ہے جو وکٹوریا گیٹ کے ٹاور میں لگی ہے اور جس کو دیکھ کر گھنٹہ بجانے والا گھنٹہ بجاتا ہے، آپ اپنی گھڑی اس سے ملا کر رکھا کیجیے۔[16]

۱۰۔ چوہدری عبدالرحمن

چوہدری عبدالرحمن مرحوم بھی ماضی قریب کے ایسے ہی ایک استاد تھے جنھوں نے ملتان شہر میں کئی نسلوں کو نہ صرف تعلیم دی بلکہ اعلیٰ اخلاق و کردار کی تربیت بھی کی۔ وہ ایک سادہ مزاج، وضع دار، شاگردوں کے ہمدرد، اعلیٰ اخلاقی اقدار سے متصف بزرگ تھے۔ چوہدری عبدالرحمن کے بارے میں لکھے گئے ان کے احباب اور تلامذہ کا معلومات افزا مجموعہ بہ عنوان محسن ملتان: چوہدری عبدالرحمن ۲۰۱۳ء میں ملتان سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں ان کے اعلیٰ کردار اور ان کی بے لوث خدمات کے متعدد واقعات درج ہیں۔ پروفیسر عبدالخالق عزمی اس موضوع پر لکھتے ہیں:

ایک خوبی میں نے چوہدری صاحب میں ایسی پائی ہے جو اچھے اساتذہ میں ہوتی تو ہے لیکن اس معیار کی کہیں دیکھنے میں نہیں آتی، وہ ہے لائق اور ہونہار طالب علموں کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی۔ ہمارے ایک دوست کی نوکرانی کا بچہ ذہین تھا۔ میں نے دیکھا کہ چوہدری صاحب اس بچے کی حوصلہ افزائی کی خاطر اس کے گھر آکر اس کی عزت افزائی کر رہے ہیں، اس سے مضامین لکھوا کر اخبارات میں شائع کرانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ امیر بچوں کو اس بچے پر رشک آرہا ہے۔ یہ بچہ جب کالج میں پہنچا تو اسے سائیکل خرید کر دی۔[17]

اسی کتاب میں چوہدری عبدالرحمن کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی تحریر فرماتے ہیں کہ:

چوہدری صاحب اساتذۂ سلف کی ایک تاریخ ساز اور تہذیب آفریں نشانی تھے۔ ان میں وہی بے نفسی، فرض شناسی اور پیشۂ معلمی سے حقیقی کومٹ منٹ تھی جو قدیم استادوں کی سیرت و کردار کا حصہ ہے۔[18]

۱۱۔ مولانا عبدالسلام قدوائی

ماضی قریب کے ایسے ہی ایک بلند کردار اور خیر خواہ استاد مولانا عبد السلام قدوائی ندوی بھی تھے۔ وہ طویل عرصے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں استاد رہے۔ ان کے نام ور شاگردوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر مشیر الحق شہید کا بھی ہے جو ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۰ء تک کشمیر یونی ورسٹی سری نگر کے وائس چانسلر رہے۔ ڈاکٹر مشیر الحق مرحوم کو مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۹۰ء کو سری نگر میں ظالموں نے شہید کر دیا تھا۔ ڈاکٹر مشیر الحق نے اپنے استاد کی تحریریں چند تصویر نیکاں کے عنوان سے مرتب کی تھیں جس کے ابتدا میں انھوں نے "میرے مولانا" کے عنوان سے اپنے عظیم استاد مولانا عبد السلام قدوائی کے حالات، محاسن اور استاد شاگرد کے تعلقات پر دل چسپ مضمون لکھ کر شامل کیا۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ۱۹۵۴ء میں وہ (یعنی ڈاکٹر مشیر الحق) جامعہ ملیہ دہلی میں داخل ہوئے۔ ان کے معاشی حالات اس قدر خراب تھے کہ بورڈنگ کے اخراجات ادا کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ اس زمانے میں مولانا عبد السلام بھی بہ حیثیت استاد وہیں مقیم تھے اور ان کا قاعدہ تھا کہ غریب طلبہ اور شاگردوں کو اپنے بچوں کے ساتھ گھر پر رکھتے اور جس حد تک ممکن ہوتا ان کی ترقی اور ان کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرتے۔ ڈاکٹر مشیر الحق لکھتے ہیں کہ مولانا نے ابتدا ہی میں طے کر لیا تھا کہ ہر ماہ ایک معمولی رقم مجھ سے لیں گے اور اس کے بعد میں کھانا، ناشتہ، دھوبی سے کپڑوں کی دھلائی، بجلی و دیگر ضروریات سے بے فکر ہو جاؤں گا۔ یہ رقم اس قدر قلیل تھی کہ دو وقت کے کھانے کے اخراجات بھی اس سے زیادہ تھے۔ جب ڈاکٹر مشیر الحق کو جامعہ ملیہ میں ملازمت مل گئی تو ایک روز مولانا نے پوچھا کہ تم جو رقم مجھے دیتے رہے اس سے تمہیں تکلیف ضرور پہنچی ہو گی اور تم سوچتے ہو گے کہ میں تم پر اتنے زیادہ اخراجات برداشت کرتا رہا اور تمحاری ملازمت کے لیے دفتروں میں مارا مارا پھرتا رہا پھر بھی تم سے یہ قلیل رقم کیوں لیتا رہا؟

آگے مولانا ہی کے الفاظ میں اس کی وجہ بیان کی:

> خود میری بیوی نے مجھ سے کئی مرتبہ کہا کہ یا تو پیسے نہ لیں اور اگر پیسے لینا ہی ہیں تو باقاعدہ حساب کر کے پورے پیسے لیں۔ مگر میں نے یہ بات نہیں مانی۔ میں یہ جانتا تھا کہ وقت گزر جائے گا، آگے جا کر کسی کو یہ یاد نہیں رہے گا کہ تم نے کتنے پیسے دیے۔ صرف اتنی بات لوگوں کو یاد رہ جائے گی کہ تم اپنے خرچ پر میرے گھر پر رہتے تھے۔ اسی طرح میرے اعزہ و

اقربا کبھی تمھیں طعنہ نہ دے سکیں گے کہ تم اپنے استاد کی روٹیوں پر پلے ہو اور تمھارے گھر والوں کی نظریں بھی میرے گھر والوں کے آگے نیچی نہیں ہوں گی۔

اس سے آگے ڈاکٹر مشیر الحق لکھتے ہیں:

نیکی کر کے دریا میں ڈالنے والے تو آج بھی مل جائیں گے لیکن مولانا جیسے کتنے لوگ ملیں گے جو اس فکر میں لگے رہتے ہوں کہ ان کی طرف نیکیوں کی نسبت بھی نہ ہونے پائے۔[19]

۱۲۔ مولانا سیّد مرتضیٰ ادیب

جناب ممتاز حسن سابق گورنر اسٹیٹ بینک اور کئی اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ وہ عمر بھر اہل علم اور علمی اداروں کے سرپرست رہے۔ انھوں نے لاہور میں ایام طالب علمی کے دوران مولانا سید مرتضیٰ ادیب سے عربی پڑھی تھی وہ اپنے استاد کی یاد میں لکھے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے مولانا پیسے والے نہ تھے نہ پیسے کی خواہش رکھتے تھے۔ نہ مشہور تھے نہ شہرت چاہتے تھے۔ ان کی زندگی، شادی غمی ہر طرح کے واقعات سے پُر تھی۔ مصائب نے بال بھی قبل از وقت سفید کر دیے تھے۔ ضبط کا وہ عالم تھا کہ اپنی تکلیف کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی کو برا کہتے نہیں سنا۔

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا۔[20]

۱۳۔ مولانا معین الدین اجمیری

ماضی قریب کے عظیم اور ایثار پسند اساتذہ میں ایک نام مولانا معین الدین اجمیری کا بھی ہے۔ وہ طویل عرصے تک اجمیر شریف میں رہے اور مدرسہ معینیہ میں بہ حیثیت استاد کئی نسلوں کو تعلیم بھی دی اور ان کی تربیت بھی کی۔ ان کے بارے میں حکیم سید محمود احمد برکاتی تحریر فرماتے ہیں:

زہد، استغنا، توکل، جرأت، حق گوئی، صبر و رضا پر عمل شدائد مولانا کی حیات کے عنوانات تھے۔ ماہانہ معاوضے کا بہت کم حصہ اپنے اہل و عیال پر صرف کرتے۔ باقی رقم طلبہ پر صرف ہوتی تھی۔[21]

۱۴۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان

ماضی قریب کے اساتذۂ کرام میں ایک اہم نام ڈاکٹر ذاکر حسین خان کا بھی ہے جنھوں نے مسلمانوں کی خاطر بہ حیثیت شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ دہلی، ایثار و قربانی کی وہ مثالیں پیش کیں جو آج کے اساتذہ میں دور دور نظر نہیں آتی۔

۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ اس زمانے میں انھیں کم از کم ۷۰۰ روپے ماہانہ کی ملازمت بآسانی مل رہی تھی لیکن انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایثار کا مظاہرہ کیا اور خود کو جامعہ ملیہ کے لیے وقف کر دیا۔ جامعہ ملیہ ایک نیا تعلیمی ادارہ تھا جسے مولانا محمد علی جوہر نے قائم کیا تھا اور خطرہ تھا کہ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ ادارہ ختم نہ ہو جائے۔ ان مشکل حالات میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ ملک و ملت کی خاطر ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے تقریباً ۲۵ سال تک ۷۰ روپے ماہانہ سے زائد تنخواہ نہیں لیں گے۔ ۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوشش سے جامعہ ملیہ کا جشنِ سیمیں منایا گیا جس میں برصغیر کے تمام اہم سیاسی رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے خطاب میں یہ سنا کر حاضرین کو حیران کر دیا کہ پچیس سال کے عرصے میں انھوں نے اور ان کے ساتھیوں میں سے کسی نے کبھی بھی پورے ۷۰ روپے ماہانہ نہیں لیے۔

بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان ہندوستان کے صدر بنے۔ اس وقت وہ غریب ہندو بنیا زندہ تھا، جس سے جامعہ ملیہ کے مشکل ترین دور میں کئی کئی مہینے قرض پر کھانے پینے کا سامان لیا جاتا تھا۔ اس غریب بنیے نے صدر بننے کے بعد ذاکر صاحب کو دعوت دی۔ ذاکر صاحب نے آمادگی ظاہر کی مگر ایوان صدر کے عملے نے کہا کہ پروٹوکول کے قوانین کی وجہ سے آپ وہاں نہیں جا سکتے۔ اس پر ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے کہا کہ اس غریب بنیے نے مجھے قرض دیا۔ میں اس کا زیر بار احسان ہوں، یہ دعوت مسترد کر ہی نہیں سکتا۔[۲۲]

۱۵۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

ماضی قریب کے ایثار پسند اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کی خاطر اپنی عمر عزیز وقف کرنے والے اساتذۂ کرام میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا بھی ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ایک نام ور ریاضی داں اور ماہر تعلیم تھے اور انھیں ریاضی میں مہارت کی بنا پر بڑی سے بڑی تنخواہ اور مراعات کے ساتھ بڑی بڑی پیش کشیں کی گئیں لیکن انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے خود کو مسلم علی گڑھ یونی ورسٹی کے لیے وقف کر دیا اور عمر بھر اس نام ور ادارے کی ترقی اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے کوشاں رہے۔ قیام ایم اے او کالج (یعنی ۱۸۹۵ء سے) ان کا اس ادارے سے تعلق قائم ہوا اور زندگی کی آخری سانسوں تک رہا۔ جن جن ملازمتوں کی انھیں جوانی ہی میں پیش کش کی گئی اس میں ڈپٹی کلکٹری، اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمۂ آثار قدیمہ اور انسپکٹر مدارس شامل ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین

احمد کو یہ بھی اعزاز حاصل رہا کہ نہ صرف ایم اے او کالج کی ترقی کے لیے بلکہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے قیام کے لیے بھی انھوں نے پورے عزم اور مستقل مزاجی سے کوششیں کیں۔ انھیں یہ بھی اعزاز حاصل رہا کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی تاریخ میں صرف وہ ہی ایسے وائس چانسلر رہے جنھوں نے تین مرتبہ بہ حیثیت وائس چانسلر اس ادارے کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے طلبہ سے اسی طرح محبت کرتے تھے جس طرح ایک شفیق باپ اپنی اولاد سے کرتا ہے۔ وہ مسلمان طلبہ کی ہر وقت اور ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار رہتے۔ وہ بڑے ذی مروت اور فیض رساں تھے، غریب و نادار طلبہ کی معاونت کرتے، بیمار طلبہ کی ہسپتال یا ان کے کمروں میں جا کر خود تیمار داری کرتے اور ان کی صحت و عافیت کے لیے کوشاں رہتے۔ یہاں تک کہ جو طلبہ یونی ورسٹی سے ڈگری حاصل کر لیتے ان کی ملازمت کے لیے بھی کوشاں رہتے اور اپنے اثر و رسوخ اور تعلقات کو استعمال کرتے۔

۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے یورپ اور امریکا کی تعلیمی ترقی کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے طویل سفر کیا۔ اسی سفر کے دوران ان کی طبیعت خراب ہوئی اور مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ان کا انتقال لندن میں ہوا۔ ان کی میت علی گڑھ لائی گئی جہاں سر سیّد کی قبر کے ساتھ ہی ان کی تدفین کی گئی۔ [۲۳]

آخر میں دل چاہتا ہے کہ عاجز اپنے چند اساتذۂ کرام کے ذکرِ خیر پر اس مضمون کو ختم کرے جن سے علامہ اقبال ہائی اسکول لطیف آباد حیدر آباد میں ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۱ء شرف تلمذ حاصل ہوا۔ ہمارا یہ اسکول انتہائی سادہ عمارتوں پر مشتمل تھا جہاں اساتذہ اور طلبہ غریب یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اعلیٰ تعلیمی معیار اور اخلاق و کردار کی تربیت کی وجہ سے یہ اسکول پورے حیدر آباد میں مشہور تھا۔ اسکول کی اس نیک نامی کے پیچھے اصل شخصیت ہمارے ہیڈ ماسٹر سیّد مشتاق علی صاحب کی تھی۔ ان کی کوشش ہوتی کہ ہر مضمون کے بہترین اساتذہ کو اسکول میں جمع کیا جائے اور یہاں سے جو طلبہ علم و کردار سے زیور سے آراستہ ہو کر عملی میدانوں میں قدم رکھیں وہ اسکول کے لیے نیک نامی کا باعث ہوں۔ مشتاق صاحب سادہ مزاج لیکن اپنے ارادوں میں چٹانوں جیسی مستقل مزاجی رکھنے والے بزرگ تھے۔ وہ کردار کی اہمیت پر بہت زور دیتے اور صرف زبانی نصیحتوں ہی سے کام نہیں لیتے بلکہ خود کو عملی نمونہ بنا کر پیش کرتے۔ یہاں تک کہ ہماری کلاس میں ان کا ایک بیٹا بھی تھا لیکن جب سزا دینے کا معاملہ ہوتا تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے بیٹے کو رعایت دی ہو اور ہمیشہ اپنی اولاد کو یہی تربیت دی کہ وہ دیگر طلبہ سے فائق نہیں ہیں بلکہ ان کے برابر ہیں۔ ہمارے اسکول کے دوسرے اہم استاد شمس الدین صاحب تھے جو ہمیشہ طلبہ کو زیور علمی سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاق و کردار اور نفاست کی تعلیم بھی دیتے۔ وہ خود بڑے نفیس مزاج شخص ہیں

اور ان کی گفتگو، ان کے لباس، ان کی شخصیت غرض ہر پہلو سے نفاست کا اظہار ہوتا۔ راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب آٹھویں جماعت میں اسکالرشپ کے امتحان دینے کا مرحلہ آیا تو محترم شمس صاحب (شمس الدین صاحب کو ہم تلامذہ محبت سے شمس صاحب کہتے اور اب بھی کہتے ہیں) ہمیں چھٹی کے بعد بھی پڑھاتے اور اس امتحان کی تیاری کراتے۔ آج کون یقین کرے گا کہ چھٹی کے بعد پڑھانے کا معاوضہ تو ایک طرف شمس صاحب ہماری تواضع اپنی جیب سے کرتے۔ مقصد صرف اور صرف اپنے شاگردوں کا فائدہ ہوتا۔ ہمارے ایک اور استاد جن کا ذکر کرنا ضروری ہے مولانا عبد العلیم ندوی مرحوم تھے جن کے کئی احسانات سے راقم کی گردن زیر بار ہے۔ ان میں ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ مولانا نے ہی راقم کو ایک موقع پر یہ نصیحت کی تھی کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا چاہیے اور گھر کے کسی اور فرد کو اس بارے میں زحمت نہیں دینا چاہیے۔ یہ نصیحت راقم نے پلے سے باندھ لی اور اس پر عمل کر کے زندگی میں بہت سی کامیابیاں حاصل کیں[۲۴]۔ اسی طرح اردو کے استاد محترم جناب قدیر الاسلام کا طریقۂ تدریس اس قدر عمدہ، شگفتہ اور دل چسپ ہوتا کہ انہی کی وجہ سے طالب علموں کا اردو ادب سے کسی نہ کسی درجے میں تعلق قائم ہو جاتا خصوصاً جب وہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح سے ماخوذ سبق مرزا ظاہر دار بیگ پڑھاتے تو یوں لگتا کہ مرزا ظاہر دار بیگ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہوں۔

استاد شاگرد کے رشتے میں آئی اس کمزوری کے بارے میں ایک نام ور اور صاحب کردار استاد ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کی رائے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے اس حوالے سے فرمایا تھا:

> شاگرد احترامِ استاد کے بغیر فیضانِ استاد سے محروم رہتا ہے۔ اس طرح استاد بھی شاگردوں کے لیے عمومی شفقت کے رویے کے بغیر اس روحانی لذت اور قلبی راحت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا جو پڑھانے کے عمل کا لازمی ثمرہ ہوتا ہے۔ معلّم اور متعلّم کے معدوم ہوتے رشتوں کی بحالی کی صورت یہی ہے کہ شفقت اور احترام کے دو طرفہ توازن کو بحال کیا جائے۔[۲۵]

جیسا کہ اوپر ذکر آیا۔ راقم نے ذاتی مطالعے کی روشنی میں محض چند اساتذۂ کرام کے چیدہ چیدہ واقعات بیان کیے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر کتب لکھی جا سکتی ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مادہ پرستی، ذاتی اغراض اور دنیاوی حرص کی دلدل میں پڑ کر ہم ایسے عظیم اساتذہ سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ آج جب میں پرائیوٹ اسکولوں کی لوٹ کھسوٹ اور تعلیم کے نام پر جہالت پھیلانے اور اخلاق و کردار سے عاری نسلیں تیار کرنے کے واقعات سنتا اور دیکھتا ہوں تو مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اور خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید آئندہ کبھی ہم

ایسے باکردار اساتذہ نہ دیکھ سکیں گے۔ ساتھ ہی جب کسی ایسے مرحوم عظیم استاد کا کوئی واقعہ پڑھتا ہوں اور اس کا آج کے مادہ پرستانہ ماحول سے موازنہ کرتا ہوں تو بے اختیار علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

حوالہ جات:

۱۔ برنی، ضیاء الدین، ۱۹۶۱ء، عظمتِ رفتہ، کراچی، ص۸
۲۔ شاہد، محمد حنیف، ۲۰۰۶ء، شمس العلماء، مطبوعہ لاہور، ص۳۱۵۔۳۳۴
۳۔ ملاحظہ فرمائیں سہ ماہی، نئی عبارت، حیدر آباد کا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نمبر۔ جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء، ص۱۷۹۔ یہ نمبر ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔
۴۔ ملاحظہ فرمائیں تحقیق، شمارہ نمبر ۴، شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی، جام شورو۔
۵۔ شیخ، محمد راشد، ۲۰۱۱ء، علامہ عبدالعزیز میمن۔ سوانح اور علمی خدمات، ص۲۶۰
۶۔ ایضاً، ص۳۱۱
۷۔ ایضاً، ص۲۹۹، نیز ملاحظہ فرمائیں سہ ماہی، صحیفہ، لاہور، جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء، ص۱۴
۸۔ شیخ، محمد راشد، ۲۰۱۴ء، ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ حیات، خدمات، مکتوبات، ص۲۷۳
۹۔ رشید، ڈاکٹر صفدر، ۲۰۱۸ء، مرتبہ: روشنی کے سفیر۔ پاکستان کے مثالی اساتذہ، ادارۂ فروغ قومی زبان اسلام آباد، ص۸۰
۱۰۔ ایضاً، ص۸۷
۱۱۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ۱۹۶۷ء، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ شفیق استاد عظیم محقق، مشمولہ: 'سوغات'، مرتبہ ممتاز منگلوری، لاہور۔ ص۴؛ اس کتاب میں ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے بیان کیا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی چالیس سالہ مدت ملازمت میں ایک دن بھی چھٹی نہیں کی۔
۱۲۔ معین الحق، ڈاکٹر سید، ۱۹۹۳ء، معین بیتی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، ص۱۸۵
۱۳۔ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، ۲۰۱۱ء، رفت و بود، مرتبہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل، ادارہ یادگار غالب کراچی، ص۵
۱۴۔ ایضاً، ص۳۶
۱۵۔ ایضاً، ص۱۳۸
۱۶۔ ایضاً، ص۳۰۳
۱۷۔ جیلانی، سید اکبر، ۲۰۱۳ء، مرتبہ: محسنِ ملتان۔ چوہدری عبدالرحمن، ص۶۰
۱۸۔ ایضاً، ص۴۸

۱۹۔ مشیر الحق، پروفیسر، ۱۹۸۹ء، مرتبہ: چند تصویر نیکاں، مکتبہ جامعہ ملیہ نئی دہلی، ص ۱۴
۲۰۔ ملاحظہ فرمایئے، مقالاتِ ممتاز، مرتبہ: شان الحق حقی، کراچی ۱۹۹۵ء، ص ۸۱
۲۱۔ برکاتی، ڈاکٹر سید محمود احمد، ۲۰۰۹ء جادۂ نسیاں، لاہور، ص ۲۷
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۱۴
۲۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سہ ماہی، فکر و نظر، علی گڑھ کا خصوصی شمارہ 'نام ورانِ علی گڑھ (دوسرا کارواں)'، جلد ۲۳ بابت ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۹۔ ۱۶۳
۲۴۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم الحروف کا مضمون: استادِ محترم مولانا عبدالعلیم ندوی کی یاد میں، ماہ نامہ، 'الحمراء'، لاہور، ستمبر ۲۰۱۳ء
۲۵۔ رشید، ڈاکٹر صفدر، ۲۰۱۸ء، ص ۶۷

Abstract

Selflessness in teachers is becoming rare in our society where once these societies were replete with such teachers who had nothing to do with monetary gain. This article provides glimpses of those teachers who not produced people of strength but also their contributions set examples for others to follow. The article provides fifteen exemplary teachers for whom any society can be proud of. There was a tendency among these selfless teachers to not only help their teachers but also support them from their meagre financial resources. Among those included are Maulana Ishaq Rampuri, Shamsul Ulema Maulvi Syed Mir Hassan, Dr Ghulam Mustafa Khan, Allama Abdul Aziz Memon, Dr Muhammed Hameedulah, Dr Ishtiaq Husain Qureshi, Dr Syed Abdullah, Dr Syed Moinul Haq, Dr Abulais Siddiqui, Chaudhary Abdul Rehman, Maulana Abdul Salam Qidwai, Maulana Syed Murtaza Adeeb, Maulana Moeen Ajmeri, Dr Zakir Husain Khan and Dr Ziauddin Ahmed.

Keywords: Selfless teachers, great teachers.